ڈاکٹر تحسین فراقی

عالمگیریت کی صورتِ حال اور فکرِ اقبال

اس وقت پوری دنیا ایک نہایت پُر آشوب صورت حال سے دوچار ہے۔ تمام نوع انسانی ایک دوراہے پر کھڑی ہے: اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں۔ ''مابعد جدید ذہن سے پرے'' (Beyond the Post-Modern Mind) کا فاضل مصنف جلال الدین ہسٹن اسمتھ بیسویں صدی کی دنیاؤں کے ہاتھوں واضح تعبیرات کو چیلنج ہوتے دکھاتا ہے۔ بظاہر متضاد و متصادم یہ وہ دنیائیں ہیں جو البرکامیو، ژاں پال سارتر اور سیموئیل بیکٹ کی آباد کردہ ''بے معنی'' اور ''اندر سے خالی'' دنیائیں ہیں۔ ان دنیاؤں کے مرکزی کردار واہموں کا شکار ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ کہاں ہیں اور ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ وہ ایک اُجاڑ کائنات میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ کافکا کے نزدیک نظام عالم ایک جھوٹ پر مبنی ہے۔ اب ذات کو تشخص صرف من کی موج سے ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارتر کا اورستس Orestes (ڈرامے The Flies میں) اپنے پورے شعور کے ساتھ اپنی ماں کو قتل کرتا ہے اور اسے مستند اور اچھا فعل سمجھتا ہے!

اگر ایک طرف سیاسی سطح پر پوری نوع انسانی ایک شدید انتشار، بدنظمی اور بے سمتی کا شکار ہے تو دوسری طرف ہولناک معاشی ناہمواری، اور سماجی ناانصافی نے اس کے وجود پر سوالیہ نشان قائم کر دیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ انسان ثقافتی سطح پر حافظے کی ایک ایسی گم شدگی کا شکار ہو گیا ہے جس کی مثال ماضی میں نایاب کے حدود میں داخل ہے۔ بڑے بڑے دعووں کے ساتھ قائم ہونے والے عالمی ادارے شدید ٹوٹ پھوٹ اور شرمناک جانبداری کا شکار

ہیں۔ جمہوریت کے نام پر بازی گری ہورہی ہے، جعلی جمہوریتوں کی پشت پناہی ہورہی ہے۔ ملک گیری کا جنون اور یک قطبی نظام نوع انسانی کے کثیر رنگی تہذیبی و ثقافتی وجود کے لیے خطرے کی نہیں موت کی گھنٹی کے مترادف ہوگیا ہے اور آزادی کی آڑ میں دماغ شوئی اور اُس کی صغیر سازی کا کام تیزی سے جاری ہے۔ ماحولیاتی آلودگی اور عالمی حرارت آفرینی Global Warming سے انسانی، حیوانی، نباتاتی گویا پورا ارضی وجود خوفناک خطرات سے دوچار ہے اور انسان بے بسی اور بیچارگی کے عالم میں نامشہود چارہ گروں سے سوال کررہا ہے: اے چارہ گرو ہے کوئی پیوند کی صورت؟ بے اختیار میلان کندیرا یاد آتا ہے جس نے کہا تھا کہ سائنس اور ٹکنولوجی کے میدان میں معجزے برپا کرنے کے بعد ڈیکارٹ کا مزعومہ ''آقا اور منتظم''، یعنی انسان اب اچانک محسوس کرنے لگا ہے کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ اب نہ وہ فطرت کا آقا ہے کہ فطرت رفتہ رفتہ اس سیّارے سے ناپید ہورہی ہے نہ تاریخ کا کیونکہ تاریخ اس کی گرفت میں نہیں آسکی۔ نہ وہ خود اپنا آقا رہا ہے کیونکہ وہ اپنے نفس کی غیر منطقی قوتوں کا غلام ہوکر رہ گیا ہے۔ اگر خدا چلا گیا اور انسان اب آقا نہیں رہا تو پھر آقا کون ہے؟ یہ سیارہ بظاہر بغیر کسی مالک کے خلا میں حرکت کناں ہے۔ یہ ہے وجود کا ناقابلِ برداشت ہلکاپن! وجود کے اس ناقابلِ برداشت ہلکے پن کو عالمگیریت کی صورتِ حال نے مزید خفیف کرڈالا ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر میں یہاں عالمگیریت یا عالم کاری اور منحرف عالمگیریت (Deviant Globalization) پر کسی قدر تفصیلی نگاہ ڈال لی جائے۔

مشہور سماجی سائنٹسٹ رولال روبرٹسن عالمگیریت کی تعریف یوں کرتا ہے:

> "The compression of the world and the intensification of consciousness of the world as a whole." (Globalization, Social Theory & Global Culture, 1992)

بظاہر وسیع اور پھیلی ہوئی دنیا کا سمٹاؤ اور اس کو ایک وحدت کے روپ میں دیکھنا

ایک مبارک سوچ معلوم ہوتی ہے۔ جدید اطلاعاتی، ابلاغیاتی اور حیران کن برق رفتار ٹکنولوجی نے دنیا کے فاصلے کم کر دیے ہیں۔ پوری دنیا نے ایک گلوبل ولیج کا روپ دھار لیا ہے۔ دنیا کے مختلف اور رنگارنگ معاشروں سے مکالمہ آسان ہو گیا ہے۔ صنعتی تمدن کی برکات میں پوری نوعِ انسانی کی مشارکت کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ سرحدوں کے بغیر نئی دنیا، ڈی ریگولیشن اور لبریلائزیشن کی نئی اصطلاحات سے لیس عالمگیریت، اطلاعات کے ایک نئے سورج کے ساتھ ہم پر طلوع ہو رہی ہے مگر جیسا کہ مہاتیر محمد نے ہمیں خبردار کیا ہے کہ ''نئی ٹکنولوجی کے ساتھ مغرب اپنے مفادات کے لیے میدان میں اُتر آیا ہے۔ اس کے بل بوتے پر وہ اقوامِ عالم کی سرحدوں میں گھس آنے کی صلاحیت سے متصف ہو گیا ہے ـــــ سرحدیں جو ملکوں اور قوموں کو الگ کرتی اور ان کا تحفظ کرتی ہیں۔ اس نئی ٹکنولوجی کے دوش بدوش اہلِ مغرب نے نئے فلسفے اور اقدار گھڑی ہیں جو اُن کے حملوں اور استحصال کو جواز عطا کرتی ہیں۔ ہمیں بغیر سوچ بچار اور جانچ پڑتال کے اور بغیر شک کے انھیں قبول نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں یہ سب اس لیے قبول نہیں کر لینا چاہیے کہ ہم دنیا کی نگاہ میں مہذب قرار پائیں۔ عالمگیریت ہمارے لیے کچھ فائدے لا سکتی ہے لیکن یہ نئی سوچ ہمیں تباہ کر سکتی ہے۔ ہماری کرنسی پر حملہ بھی عالمگیریت ہی کا ایک حصہ ہے۔''[۱]

پھر یہ یاد رکھنا ہوگا کہ عالم کاری یا عالمگیریت کے دیگر اجزا بھی اپنی تہہ میں گہری معنویت کے حامل ہیں مثلاً معاشی عالمگیریت، سیاسی عالمگیریت، معاشرتی عالمگیریت، ابلاغیاتی عالمگیریت اور ماحولیاتی عالمگیریت۔ عالمگیریت کے علم برداروں کا دعویٰ ہے کہ عالمگیریت انسانی فلاح اور ماحولیاتی ارتقا میں اہم کردار ادا کرے گی تاکہ نوعِ انسانی کو راحت میسّر ہو اور یوں کروڑوں غریب انسان غربت کی دلدل سے باہر نکل سکیں۔ آزاد تجارت، جمہوریت، انسانی حقوق، امنِ عالم اور عالمی آفاقی حکومت کے نعروں کے جلو میں عالمگیریت کا یہ شاندار کوکبۂ شاہی دراصل گہری تنقیدی بصیرت کا متقاضی ہے۔ اقبال نے مغرب کی اسی گندم نما جو فروشی کا ادراک کرتے ہوئے اپنی مشہور نظم ''خضرِ راہ'' میں ''سلطنت'' کے ذیلی

عنوان کے تحت لکھا تھا:

"آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیہ اِنَ المُلوک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلادیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری[۲]

کم و بیش ڈھائی تین برس پہلے تین مغربی دانشوروں نے مضامین کا ایک مجموعہ "Deviant Globalization" کے زیرِعنوان اور ذیلی سرخی "Black Market Economy in the 21st Century" کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کتاب کیا ہے، غریب، بے بس کمزور انسانوں کے استحصال اور صاحبِ اقتدار افراد کی دسیسہ کاریوں، عالمی فریب کاریوں اور نقاب پوش عیاریوں کی ایک جدید طلسم ہوش ربا ہے۔ اس کتاب سے چند مفاہیم کا ترجمہ اور خلاصہ دلچسپی اور دلچسپی سے زیادہ عبرت اندوزی کی خاطر پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بیان کردہ حقائق بڑے چشم کشا اور عبرت زا ہیں۔ عالمگیریت کی وضاحت کے ضمن میں ذیل کا اقتباس قابلِ توجہ ہے:

"یہ بہت شاذ ہوا ہے کہ کوئی مخصوص، چلتا ہوا معاشی لفظ یا اصطلاح دس برس سے زیادہ زندہ رہے مگر عالمگیریت کی اصطلاح اب تک چل رہی ہے۔ یہ اصطلاح ۱۹۸۰ء میں وضع ہوئی۔ پھر ۱۹۹۰ء سے ہوتی ہوئی سنہ دو ہزار میں داخل ہوئی اور گمان ہے کہ اس پر بحث دس برس مزید چلے[۳]۔ تاہم عالمگیریت کی اصطلاح کی تعریف اتنی آسان نہیں۔ لوگ اکثر اس کے ضمن میں بحث کرتے

اس اصطلاح کی تعریف کی جائے تو اس کا معنی ہے "قدر و قیمت سے مربوط سرحد عبور معاشی سرگرمی"۔ یہ ارتباط اس لیے واقع ہوتا ہے کیونکہ معاشی سرگرمی کے بنیادی عناصر و اجزا زیادہ متحرک ہوگئے ہیں ـــــ اشیا، خدمات، روپیہ پیسہ، لوگ، افکار و خیالات بغیر کسی مخصوص باہمی نظم کے نہایت تیزی سے زمان و مکان اور سیاسی حد بندیوں کے مابین متحرک ہوگئے ہیں۔[۵]

آگے چل کر مرتبین لکھتے ہیں کہ "۱۹۹۰ء میں چند کلمات و الفاظ کا چلن ہوا اور یہ جلد ہی فرسودہ ہوگئے مثلاً "جغرافیے کا خاتمہ"، "فاصلے کی موت"، "تاریخ کا خاتمہ"، نیٹ ورک سوسائٹی، اور سب سے بڑھ کر ٹوم فرائیڈمین کا دہ سالہ کلیشے: "The World is Flat"۔ ان سب نے دنیا کی ایک ایسی تصویر بنائی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ زمان و مکان کی طنابیں کھنچ گئیں اور اس کے فیض سے ہر شخص ہر جگہ جاسکتا اور ہر شے پاسکتا ہے۔"

"آج عالمگیریت کے خلاف ملی جلی آوازوں کا ایک غوغا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ نظام سیاسی معاہدوں اور فطری ماحول کی تباہی کا باعث ہوگا، آبادیوں کے انتقال پر منتج ہوگا، انسانی صحت کی جڑ مار دے گا، شہریوں کو تحفظ فراہم کرنے کے ریاستی اقدامات کا استیصال کرے گا اور ہر اس شے کو جس کا انسان سے تعلق ہے بربادی سے دوچار کردے گا۔"[۶]

حقیقت یہ ہے کہ عالمگیریت کی بظاہر خوش کن اصطلاح کے پس پردہ استحصالی محرکات اور کولونیل تصورات ہی کارفرما ہیں۔ یہ ایک طرح کی نیوکولونیلزم ہے۔ ایک سابقہ عالمی طاقت یعنی سوویت یونین نے اپنے عروج کے زمانے میں اشتراکیت کو دیگر ملکوں میں برآمد اور نافذ کرنے کے لیے ثقافتی و سیاسی عالمگیریت کا افسوسناک حربہ استعمال کیا۔ ۱۹۹۰ء میں سوویت یونین کے زوال کے بعد اب صرف ایک عالمی طاقت میدان میں ڈٹی ہوئی لِمَنِ الملکُ الیوم کا ڈنکا بجارہی ہے اور عالمگیریت کے پردے میں اپنی بے لگام ہوا و ہوس کے ناز اٹھارہی ہے۔ مغربی اور امریکی سرمایہ داری نظام کی کوکھ سے جنم لینے والی عالمگیریت کے اصل چہرے سے نوم چومسکی اور ایڈورڈ سعید جیسے مغربی نظام سیاست کے مستند نقادوں نے جس خوبی سے نقاب سرکائی ہے یہ انھی کا حصہ ہے۔ چومسکی نے اپنی کتب World Orders Old &

New، Interventions، اور Understanding Power میں اور ایڈورڈ سعید نے اپنی نہایت قابلِ قدر کتاب Orientalism اور بعد میں شائع ہونے والی کتب Covering Islam اور Culture & Imperialism میں مغرب اور خصوصاً امریکی فریب کاریوں کو بڑی خوبی سے طشت ازبام کیا ہے۔ ان مباحث سے تو میں ذرا آگے چل کر اعتنا کروں گا، سرِدست تو قبل ازیں مذکور کتاب "Deviant Globalization" کے چند اہم مباحث کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ کتاب کے مرتبین کا موقف ہے کہ منحرف عالمگیریت، دراصل عالمگیریت سے ناقابلِ جدا طریقے سے جڑی ہوئی ہے۔ دونو منڈیوں سے مربوط معاشی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں۔ دونو عالمی سطح پر مربوط معاشی، ابلاغیاتی اور ذرائع نقل و حمل کے نظاموں ہی کے ذریعے تکمیل پاتے ہیں۔ دونو سیاسی، معاشی، عُمرانی اور ماحولیاتی سرحدوں کو توڑتے ہیں اور دونو عالمگیریت کے برسرِعمل پلیٹ فارم پر اکٹھے پائے جاتے ہیں۔ کریگزلسٹ پر مشتہر امریکی جنس فروشوں (Sex Workers) کو دیکھ کر ممکن ہے ہمیں تکلیف پہنچے لیکن انتہائی تیز رفتار آن لائن کلاسیفائڈ اشتہاری سہولت سے اُن کا استفادہ گھروں کو رنگ و روغن کرنے والوں کے استفادے سے مختلف نہیں۔ ایک چینی جہازران کمپنی کا برما کے جنگلوں سے غیر قانونی طور پر کاٹی گئی لکڑی کے کنٹینرز کو اٹلی کے کسی فرنیچر ساز ادارے کو مہیا کرنا غلط سہی لیکن یہ سب کچھ بہرحال مربوط اور منظم جہازرانی نظام ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ عالمی معیشت کا انفرا اسٹرکچر دراصل دوجہتی استعمال رکھتا ہے اور اقدار آزاد Value Neutral ہے۔

عالمی معیشت کے اقدار سے آزاد ہونے ہی کا شاخسانہ ہے کہ سرحدوں کے آرپار معاشی نیٹ ورک بے محابا مصروفِ کار ہیں اور یہ نیٹ ورک ہر طرح کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی کاموں میں ملوث ہیں مثلاً منشیات، نایاب جنگلی حیات، چرائے ہوئے نوادرات، جعلی اشیاء، کالادھن، زہرآلود فضلات (Toxic Wastes) اور ان کے ساتھ ہی ساتھ خود انسانوں کی اسمگلنگ اور ناجائز جنسی سرگرمیاں۔

آپ اس حقیقت سے یقیناً آگاہ ہوں گے کہ مشرقی بحرالہند میں آنے والے سونامی میں ڈھائی لاکھ افراد ہلاک ہوگئے تھے مگر اس بات سے کم لوگ واقف ہوں گے کہ سونامی کے ختم ہوتے ہی دلاّلوں کے ٹولے انڈیا اور سری لنکا میں داخل ہوگئے اور تباہ شدہ خاندانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے انھیں سیکڑوں ڈالر دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے بدلے میں انھوں نے صرف ایک مطالبہ کیا—— ناامید بیماروں کی اعانت یعنی آسام اور بمبئی کے ڈائی ایلیے سز مراکز میں گردے پیوند کرانے کے منتظر بیمار امریکی، مشرق وسطائی اور اسرائیلی لوگوں کو یہ سونامی زدہ برباد لوگ اپنے گردے بیچ دیں!

عالمگیریت نے ایسی سیاہ منڈیوں کو بھی جنم دیا ہے جہاں زندہ یا مردہ انسانوں کے اجسام سے حاصل کیے گئے گردے، جگر، دل اور دوسرے اعضا بکتے ہیں۔ انسانی اعضا کی اس تجارت میں قانونی اور غیرقانونی دونو طرح کے افراد شامل ہوتے ہیں۔ ظاہر بات ہے انسانی اعضا جس طرح بھی حاصل کیے گئے ہوں، ان کی پیوندکاری ماہر اور قانونی پیشہ ور حضرات کے تعاون کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ گویا سرجنوں اور نیفرالوجسٹوں کی قانون شکن اعضا فروشوں سے ملی بھگت کے بغیر یہ کام ناممکنات میں سے ہے۔

صرف یہی نہیں بین الاقوامی سطح پر سیکس ٹریڈ زوروں پر ہے۔ نہ اس کی طلب میں کمی ہے نہ رسد میں۔ جنوبی امریکہ کے بعض حصوں، ایشیا اور سابقہ سوویت یونین کے غریب گھرانوں سے لڑکیوں اور عورتوں کو بہلا پھُسلا کر یا ملازمتوں کا جھانسا دے کر امیر قوموں اور شہروں مثلاً ماسکو، ٹوکیو، ترکی، دوبئی، جرمنی اور امریکہ میں لایا جاتا ہے۔ فلپینز میں بھی یہ کاروبار زورشور سے جاری ہے۔ اقبال نے ضربِ کلیم میں ایک جگہ بڑی دردمندی سے یورپ اور شام کا ذکر کرتے ہوئے اہلِ یورپ کو ہدفِ تنقید بنایا ہے اور ان کی عیش کوشی اور عفت فراموشی نیز احسان فراموشی کا ماتم کیا ہے:

فرنگیوں کو عطا خاکِ سُوریا نے کیا

نبیِ عفتؑ و غم خواری و کم آزاری
صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لیے
مئے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری ۷

امرِ واقعہ یہ ہے کہ ہر تہذیب اپنا ایک مخصوص تصور حیات اور تصور حقیقت رکھتی ہے۔ مغربی فکر جن مختلف دھاروں سے گزر کر بیسویں صدی کی دہلیز پر پہنچی وہاں اعلیٰ اور پامال کا فرق مٹ چکا تھا۔ لمحۂ موجود ہی سب سے بڑی حقیقت تھا۔ انسان ہی ہر شے کا پیمانہ تھا۔ کسی بڑی مابعدالطبیعیاتی صداقت سے انکار اور انسان مرکزیت کے تصورات نے مغرب کو جس مادی دلدل میں جادھکیلا، جدید معاشی اور عُمرانی تصورات اسی کے زائیدہ اور پروردہ ہیں۔ نٹشے کا دیوانہ آدمی گلیوں میں وحشیانہ انداز میں بھاگتا ہوا خدا کی موت کا اعلان کرتا ہے۔ نٹشے عیسوی مذہب کو غلامانہ ذہنیت کا مظہر گردانتا تھا۔ خدا کی موت کے اعلان کے بعد مغرب آزاد ہے۔ ظاہر ہے خدا مر گیا تو اب ہر شے کی آزادی ہے۔ اب دنیا اور علائقِ دنیا ہی سب سے بڑی حقیقت بن گئے۔ جب عقبیٰ کا تصور نظر سے اوجھل ہو جائے تو دنیا ہی مرکزِ نگاہ بن جاتی ہے۔ عیشِ امروز، دولت طلبی، جاہ و حشمت، دنیوی اقتدار ہی سب سے بڑے ہدف بن جاتے ہیں۔ مغرب کے ساتھ یہی حادثہ ہوا۔ ہسٹن اسمتھ نے کس قدر درست لکھا ہے کہ

> "The twentieth century replaced utopias with dystopias." ۸

''ڈسٹوپیا'' وہ خیالی جگہ ہے جہاں ہر شے بُری ہو۔ شاید یہیں سے اُس Cult of ugliness نے جنم لیا جس سے جدید مغربی ادب کا بڑا حصہ بھرا پڑا ہے۔

آج امریکہ جس عالمگیریت کا صُور پھونک رہا ہے اور جس نیو ورلڈ آرڈر کا ڈنکے کی چوٹ اعلان کر رہا ہے اس میں بقول چومسکی نئی ابھرنے والی قوموں کا کوئی حصہ نہیں۔ یہ ایک نئی استعماریت ہے جس کا مقصد بے بس اور حاشیائی افراد اور اقوام کو کمزور تر کرنا اور ان کے وسائل پر قابض اور متصرف ہونا ہے۔ چومسکی کے نزدیک بی بی سی کا معاشی نامہ نگار جیمز مورگن

آئی ایم ایف، ورلڈ بنک اور جی سیون وغیرہ کو ایک نئی مگر اصلی اور حقیقی defacto عالمی حکومت سے تعبیر کرتا ہے ـــــ ایک نیا استعماری عہد ـــــ قوی اور مضبوط شمالی ممالک جنوب پر متصرف ہو رہے ہیں جس کے نتیجے میں وہاں کی حکومتوں کو پسے ہوئے عوام کے غیظ و غضب کا سامنا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ حکومتیں عالمی معیشت کا نظام ان پر مسلط کرنے میں معاون ہیں اور جس کے نتیجے میں ان مظلوموں کا معیار زندگی پست ہوتا جا رہا ہے۔ یہ حقیقی defacto حاکم اندر ہی اندر برسرکار ہیں اور ایک ایسی دنیا کو وجود میں لا رہے ہیں جو سرمایہ کاروں کی ضروریات کے مطابق ہو۔ (ورلڈ آرڈرز، اولڈ اینڈ نیو، ص ۱۷۸)

جنوری ۱۹۹۴ء میں سان سلواڈور میں منعقد ہونے والی کانفرنس کا خلاصہ یہ تھا کہ مرکزی امریکہ (یعنی میکسیکو کی جنوبی سرحد سے شروع ہو کر کولمبیا کی شمال مغربی سرحد تک گوئٹے مالا، ایل سلواڈور، نکاراگوا اور پانامہ تک کا علاقہ) کو آج ایک ایسی عالمگیریت کا سامنا ہے جس کے نتیجے میں وہ ایسی تباہ کن لوٹ کھسوٹ سے دوچار ہے جو آج سے پانچ سو برس پہلے بھی جب اسے فتح کر کے نوآبادی بنایا گیا تھا، پیش نہیں آئی تھی۔ اس قول کا اطلاق تمام ترقی پذیر ممالک پر کیا جا سکتا ہے (ایضاً، ص ۱۷۹)

نوم چومسکی جس دردناک استحصالی صورتِ حال کو بیان کر رہا ہے، اقبال کو اس سے بہت پہلے اس کا نہایت خوبی سے ادراک تھا۔ اقبال سرمایہ داری نظام کو بنی نوع انسان کے لیے ایک کڑی آزمائش قرار دیتے تھے۔ آپ ان کی نظم ''لینن خدا کے حضور میں'' پڑھ جایئے اور دیکھیے کہ انھوں نے لینن کی زبان سے کیسے تلخ اور پوست کندہ حقائق بیان کر دیے ہیں[۹]۔ آج کے ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف وغیرہ کی سخت اور غیر انسانی شرائط اور سود در سود کا افسوسناک دھندا غریب اقوام کا خون چوسنے کے مترادف نہیں تو کیا ہے؟:

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

رعنائیِ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جواء ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات[۱۰]

سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات، اس مصرعے میں حضرتِ علامہ نے ایہام رکھا ہے۔ سود فائدے کے معنی میں بھی اور Interest کے معنی میں بھی۔ جاوید نامے میں بھی جمال الدین افغانی کی زبان سے سود کی مذمت کی ہے۔ جمال الدین افغانی نے ملتِ روسیہ کو پیغام دیتے ہوئے کہا تھا:

چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو
لَن تَنَالُوا البِرَّ حَتّٰی تُنفِقُوا

از رِبا آخر چہ می زاید؟ فتن
کس نداند لذتِ قرضِ حسن

از رِبا جاں تیرہ، دل چوں خشت و سنگ
آدمی درندہ، بے دندان و چنگ[۱۱]

خلاصہ یہ کہ سودخوری سے روح تاریک اور دل سنگ وخشت کی طرح متحجر ہو جاتا ہے اور آدمی بے دندان و چنگ درندہ بن جاتا ہے۔ کیا آج کے ورلڈ بنک، آئی ایم ایف اور ورلڈ ٹرنڈ آگنائزیشن اور اس طرح کے متعدد مالیاتی ادارے جو دراصل عالمگیریت ہی کے

دست و بازو ہیں، بے دندان و چنگ درندوں کی مانند نہیں جن کا کام صرف اپنے اہداف کو چیرنا پھاڑنا اور ان کا خون پینا ہے۔ آخر شائیلاک دی جیو نے بھی تو اپنے ہدف کے جسم سے ایک پونڈ گوشت کا مطالبہ ہی تو کیا تھا۔ ضیاء الدین سردار اور میری ون ڈیویز نے اپنی کتاب "Why do People Hate America"? میں، جس کے ایک دو نسبتاً تفصیلی حوالے آگے آتے ہیں، لکھا ہے کہ پوری دنیا کے ساتھ اپنے برتاؤ کے حوالے سے امریکہ کا کردار عمومی جسامت سے بڑھے ہوئے اس شانزدہ سالہ نوجوان دھمکاؤ (bully) کا ہے جو اپنے طرزِ عمل پر پابندی قبول کرتے ہوئے مسلسل اپنے غم و غصے کا اظہار کرتا ہے اور یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ اس کے اس طرزِ عمل کے دوسروں کی زندگی پر کیسے کیسے منفی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ کسی ملک کی معاشی پالیسیوں کو پسند نہیں کرتا تو وہ آئی ایم ایف اور ڈبلیو۔ ٹی۔ او کے ذریعے انھیں کچل ڈالتا ہے اور اگر اس کا بھی حسب منشا نتیجہ نہیں نکلتا تو یہ اس ملک پر پابندیاں لگا دیتا ہے یا پھر اس کے سربراہوں کا تختہ الٹ دینے کا اہتمام کرتا ہے (مثلاً ایران، چلّی، گوئٹے مالا)[۱۲]۔ اس کارروائی کی تازہ ترین مظہر مملکتِ مصر ہے۔

اقبال نے فلسطینی عرب سے مخاطب ہو کر کس قدر درست کہا تھا:

تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

یہ حقیقت جتنی اقبال کے عہد میں سچ تھی اس سے زیادہ آج سچ ہے! حد تو یہ ہے کہ مغربی بنکوں میں رقوم جمع کرانے والے کھاتے دار بھی ان بنکوں سے ایک حد سے زیادہ رقم نہیں نکلوا سکتے[۱۳]۔ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن حکم لگاتی ہے کہ کمزور اور غریب ممالک اپنی کرنسی کی قیمت کم کریں۔ اپنی پیداوار ایک حد سے آگے برآمد نہ کریں۔ بین الاقوامی منڈی میں قیمتیں امریکہ اور اس کے حاشیہ نشین متعین کرتے ہیں۔ یہ ہے عالمگیریت کی غریب نوازی اور بندہ پروری!

عالمگیریت کے وجود سے جنم لینے والی امریکن کارپوریشنیں بھی استحصال کا آلۂ کار ہیں۔ چومسکی کے نزدیک یہ کارپوریشنیں مستقبل کی ٹکنولوجی پر قابض ہوں گی۔ اس ٹکنولوجی میں بائیوٹکنولوجی بھی شامل ہے جس کے نتیجے میں صحت، زراعت اور دیگر عمومی ذرائع پیداوار پر پرائیویٹ اداروں کا قبضہ ہوگا اور یوں غریب اکثریت مغربی ایگری بزنس، بائیوٹکنولوجی اور دواساز انڈسٹری کی محتاج ہوگی[۱۱]۔ (ورلڈ آرڈرز۔۔۔ص ۱۸۳)

عالمگیریت کا نعرہ ہے ''آزاد تجارت'' مگر یہ بھی محض ایک نعرہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نارتھ ایمیریکن فری ٹریڈ ایگریمنٹ NAFTA کا اطلاق صرف شمالی امریکہ پر ہوتا ہے۔ یہ ''آزاد'' نہیں، یہ ''تجارت'' سے متعلق نہیں اور یہ بے بس عوام سے کسی ''معاہدے'' یعنی اگریمنٹ کا نتیجہ نہیں۔ اس کا مقصد بقول چومسکی نئے استعماری عہد کے آقاؤں کے ہاتھوں میں دولت اور اقتدار کو مرتکز رکھنا ہے اور بس۔

نوم چومسکی نے ایک جگہ ''بُش ڈاکٹرین'' کا بھی ذکر کیا ہے جس کی عبارت یہ ہے:

> ''امریکہ ایک لمبے عرصے تک دنیا پر حاکم رہے گا اور اس حاکمیت کے خلاف ہر چیلنج کو تباہ و برباد کرتا رہے گا۔''

یہ ڈاکٹرین ایک واضح اعلان ہے نئی امریکی سامراجیت کا۔ یہ بات معلوم ہے کہ عرب دنیا میں انرجی کے بے مثال ذخائر موجود ہیں۔ غیر ملکی سرمایہ کاری کے لیے یہ زرخیز زمین تھی چنانچہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکی کارپوریشنوں نے اپنے قدم مضبوطی سے جمالیے۔ اقبال کو اپنے عہد میں اس امر کا اندیشہ تھا کہ مغربی سامراج ان توانائی کے اہم ذخائر پر قابض نہ ہو جائے۔ چنانچہ ''پس چہ باید کرد'' میں وہ ''حرفے چند بہ اُمتِ عربیہ'' میں بڑے اخلاص سے عرب امت کی فہمائش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

> ترجمہ: امتیں اور قومیں آگے نکل گئیں، افسوس تجھے تیرے صحرا کی قدر و قیمت کا شعور نہیں۔ تُو ایک امت تھی مگر افسوس تیری وحدت پارہ پارہ ہوگئی اور تو کئی امتوں میں بٹ گئی۔ تُو نے اپنی بزم کو خود برہم کردیا۔ جو بھی شعورِ ذات کے بندھن سے آزاد ہوا، ہلاک ہوگیا، جو بھی بیگانوں سے جاملا موت سے ہمکنار ہوگیا۔ تو نے اپنے

ساتھ جو کچھ کیا کسی نے نہ کیا ہوگا۔ اس صورتِ حال نے حضور اکرمؐ کی روح کو دکھ پہنچایا۔ تو فرنگی کے جادو سے بے خبر ہے۔ اس نے اپنی آستین میں کئی فتنے پال رکھے ہیں۔ اگر تو اس کے فریب سے نجات چاہتا ہے تو اس کے اونٹوں کو اپنے حوض سے بھگادے۔ اس کی عیاری نے ہر قوم کو بے بس کردیا۔ عربوں کی وحدت پارہ پارہ کردی''[15]

مندرجہ بالا اقتباس میں اونٹ اور حوض کے استعارے بڑے معنی خیز ہیں۔ اونٹ سے یہاں مراد وہ استحصالی کردار ہے جو کثیر ذخیرہ ہڑپ کر جاتا ہے جیسے اونٹ اپنے وسیع و عریض پیٹ میں کئی گیلن پانی ذخیرہ کرلیتا ہے۔ حوض سے مراد عربوں کے تیل کے چشمے ہیں جو اگرچہ اس وقت تک پوری طرح سامنے نہیں آئے تھے مگر اقبال کی ایمانی اور وجدانی بصیرت کے سامنے بے نقاب تھے۔ ایڈورڈ سعید نے ''کلچر اینڈ امپیریلزم'' میں عراق پر ۱۹۹۰ کے امریکی حملے کا اپنے مخصوص تجزیاتی اسلوب میں ذکر کرکے اس کے عزائم کو بڑی خوبی سے بے نقاب کیا ہے:

''عراق کو اب بھی تباہ کیا جا رہا ہے ___ بھوک، بیماری، یا سیت سے۔ اس لیے نہیں کہ اس نے کویت پر جارحیت کی بلکہ اس لیے کہ امریکہ خلیج میں اپنی ذاتی موجودگی کا متمنی ہے تاکہ وہاں کے تیل پر اس کا براہِ راست تسلط ہو۔ یہ اس لیے کہ یورپ اور جاپان کا گلا دبایا جاسکے۔ امریکہ ایک عالمی ایجنڈا رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ عراق اب بھی اسرائیل کے لیے خطرہ ہے'' (کتاب مذکور ص ۳۶۴)

حقیقت یہ ہے کہ ۲۰۰۳ء میں امریکہ کا عراق پر حملہ اور اس کی تباہی و بربادی اسی خوفناک ایجنڈے کا حصہ تھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک زمانے میں عراق کا صدام امریکہ کی آنکھ کا تارا تھا۔ اس وقت امریکہ نے صدام حسین کی شخصیت سازی کی۔ پھر اسے شیطان ثابت کیا۔ سعید کے نزدیک تیسری دنیا کا ایک چھوٹا سا آمر ملک (عراق) جسے خود مغرب نے پالا، اس کی مدد اور معاونت کرتا رہا، یہ حق کیسے رکھتا ہے کہ وہ امریکہ کو چیلنج کرے ___ امریکہ جو گورا اور برتر ہے۔ برطانیہ نے ۱۹۲۰ء میں عراقی فوج پر بمباری کی تھی کیونکہ اس نے

استعماری حاکمیت کی مخالفت کی جرأت کی تھی۔ ستر برس بعد ۱۹۹۰ء میں امریکہ نے بھی یہی کیا مگر اخلاق آموزی کے لہجے میں اور اس دعوے کو بغیر چھپائے کہ مشرقِ وسطیٰ کے تیل کے ذخائر پر امریکہ کا حق ہے۔ یہی نہیں بلکہ امریکی ذرائع ابلاغ پر یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ عراق، ایران اور سعودی عرب کے درمیان ایک ملک ہے جس کا کلچر، کتاب اور اعلیٰ افکار سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ حال آنکہ اسکولی بچے بھی جانتے ہیں کہ بغداد عباسی تہذیب کا بہت بڑا مرکز تھا یہی وہ جگہ ہے جہاں قاہرہ اور دمشق کے دوش بدوش انیسویں اور بیسویں صدی میں عربی فنون اور ادب کا احیا ہوا۔ یہ کہنا کہ بغداد اور اس کے شہریوں کا کتابوں اور خیالات سے کوئی رشتہ نہیں، حافظے کی گم شدگی کا اشتہار دینے کے مترادف ہے۔ یہ سُمیر، بابل، نینوا، حمورابی، آشوری اور قدیم میسوپوٹیمائی عالمی تہذیب کو فراموش کر دینے کے مترادف ہے جس کا گہوارہ عراق تھا۔ (کتاب مذکور ص ۳۵۹، ۳۶۰)

امریکہ کے اسی استعماری عالمگیری ایجنڈے کا حصہ اس کا وہ خودستائی کا روّیہ بھی ہے جو Us اور Them کی اصطلاحات میں ظہور پاتا ہے۔ یعنی ہم اعلیٰ اور برتر ہیں، ہمارے حریف برے اور کم تر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اپنے عوام کو باور کراتا رہتا ہے کہ دنیا کی برائیوں کی اصلاح ''ہمارا'' منصب ہے۔ سعید کے نزدیک امریکہ کو زعم ہے کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے، نسل انسانی بھی وہی چاہتی ہے۔ وہ ایک عرصے سے مرکزی اور جنوبی امریکہ کے معاملات میں کھلم کھلا اور براہِ راست مداخلت کی فعال پالیسی پر گامزن ہے۔ کیوبا، نِکاراگوا، پانامہ، چلّی، گوئٹے مالا، سَلواڈور، گریناڈا کے اقتدارِ اعلیٰ پر متعدد حملے ہو چکے ہیں [۱۹]۔ یہ حملے جنگ اور تختے الٹنے تک کی وارداتوں پر مشتمل ہیں۔ اس میں قاتلانہ حملے اور مخالف افواج کو سرمایہ فراہم کرنے تک کے غیر شریفانہ اقدامات شامل ہیں۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ امریکہ نے اور ملکوں کے علاوہ لاطینی امریکہ کے تقریباً سب ملکوں پر حملے کیے ہیں۔ اس ضمن میں ضیاء الدین سردار اور میری وِن ڈیویز کی کتاب

"Why do People Hate America" کا ذیل کا اقتباس آنکھیں کھول دینے والا ہے:

> "The United States has repeatedly intervened both militarily and through covert action in almost every Latin American state: Bolivia, Brazil, Columbia, Cuba, Dominica, Ecuador, El Salvador, Guatemala, Haiti, Honduras, Jamaica, Mexico, Panama, Peru, Surinam, Uruguay. Ostensibly these interventions have been in defence of 'democracy', 'human rights', 'freedom' but somehow they always end up securing markets for America. They have taken place to support or bring to power some of the most noted violators of 'democracy', 'human rights' and 'freedom'."[۱۷]

گیارہ ستمبر کے المیے کے بعد ''کاونٹر پنچ'' کے معاون قلمکار اور امن عالم کے علمبردار صحافی زولٹن گراس مین نے نہایت محنت اور تحقیق کے ساتھ امریکی فوجی مداخلتوں کی ایک جامع فہرست شائع کی جس کا عنوان تھا: "A Century of US Military Interventions from Wounded Knee to Afghanistan"۔ ضیاء الدین سردار اور ان کی معاون نے اپنی مذکورہ کتاب میں وہ فہرست شائع کردی ہے جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آزادی اور حقوق انسانی کے نام پر کس قدر شدت کے ساتھ تباہی و بربادی کی راس رچائی گئی[۱۸] اور ابھی اس کے ختم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ کورنیل یونیورسٹی کے رونلڈ جے ہیرنگ کا یہ قول کتنا سچا ہے کہ عالمی سطح پر ایکشن کی امریکی آزادی اپنے پیچھے بیسیوں کچلے ہوئے ملک چھوڑ گئی ہے۔ کیا ستم ہے کہ اگر عراق کویت پر چڑھ دوڑے تو قابلِ مذمت اور اگر خود امریکہ کمزور ممالک پر سلب ونہب کرے تو یہ اس کا حق ہے اور شیرِ مادر کی طرح جائز ہے۔

نوم چومسکی نے اپنی مشہور کتاب "Rogue States" میں ایک جگہ نہایت طنزیہ انداز میں لکھا ہے:

> ''بدمعاش ریاست (روگ اسٹیٹ) کے معنی میں کئی نزاکتیں ہیں مثلاً کیوبا

ایک سرکردہ بدمعاش ریاست ہے کیونکہ وہ مبینہ بین الاقوامی دہشت گردی میں ملوّث ہے مگر امریکہ اس صف میں شامل نہیں جبکہ وہ کیوبا پر تقریباً چالیس برس سے وقتاً فوقتاً حملہ آور ہوتا رہا ہے" (کتاب مذکور ص ۲۹)

اقبال نے استعمار کے اسی دو غلے پن کو مسولینی کی زبان سے نہایت موثر پیرائے میں ادا کیا ہے۔ جب مسولینی نے حبشہ پر حملہ کیا تو وہ حریف مغربی ملکوں کا ہدف تنقید بنا چنانچہ وہ جواباً کہتا ہے:

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج!

میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج؟

تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج

پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج [۱۹]

کس قدر ستم ظریفی ہے کہ ایک طرف مغرب اور امریکہ ملٹی کلچرل ازم اور جمہوریت کا راگ الاپتے ہیں مگر دوسری طرف اپنے سوا تیسری دنیا کی قوموں کو غیر مہذب اور جاہل ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ ان کے تہذیبی اوضاع کو بہ نظر حقارت دیکھتے ہیں اور ان کے استحصال اور استیصال کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بدقسمتی سے یورپ اور امریکہ اب تک رُڈیارڈ کپلنگ کے الاپے ہوئے راگ "Whiteman's Burden" کا ورد کرتے چلے جاتے ہیں اور انھیں مشرق کے انسان اب بھی Half Devil & Half Child دکھائی دیتے ہیں۔ سعید لکھتا ہے کہ نیشنل گیلری آف ایمیریکن آرٹ میں ۱۹۹۱ء

میں ایک تصویری نمائش لگائی گئی جس میں انیسویں صدی کی امریکی مصوری میں امریکہ کے مقامی باشندوں یعنی سرخ ہندیوں کی تصاویر بھی شامل تھیں جن کے خدوخال میں شرافت، احساسِ فخر اور تفکر کی جھلک تھی۔ ان کی وضاحت کے لیے دیوار پر ایک عبارت بھی درج کی گئی تھی جس میں سفید پوست افراد کے ہاتھوں ان کی تذلیل کا تذکرہ تھا۔ اس طرح کی ''ردِ تشکیلی جسارت'' امریکی کانگرس کے ارکان کے غیظ وغضب کا موجب بنی خواہ وہ تصاویر خود انھوں نے دیکھیں یا نہیں۔ بہرحال انھوں نے مذکورہ عبارت کی غیر حب الوطنی اور اس کے غیر امریکی مزاج پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ پروفیسروں، نام نہاد دانشوروں اور صحافیوں نے بھی اسے ہدفِ تنقید بنایا اور اسے امریکہ جیسے بے نظیر ملک کی تذلیل قرار دیا[۲۰]۔ یہ ہے امریکی جمہوریت اور ملٹی کلچرازم کے بڑے علمبردار کی حقیقی تصویر۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ امریکی کانگرس کے اراکین، پروفیسروں، دانشوروں اور صحافیوں کو ریڈ انڈینز کے بارے میں تاریخی حقائق پر مبنی ایک بے ضرر جملے نے مبتلائے اذیت رکھا مگر وہ اس ہولناک اذیت کو بھول گئے جو تاریخ کے خونچکاں اوراق میں اب بھی محفوظ ہے اور جس کے مطابق اٹھارھویں صدی سے انیسویں صدی تک کے ایک سو برس کے عرصے میں امریکی حکام نے ۸ملین سرخ ہندیوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔ تاریخ فراموشی اور تاریخ ناشناسی کی یہ عبرت ناک مثال ہے جو حافظے کی گم شدگی یا دانستہ فراموشی کے نتیجے میں ظہور کرتی ہے تاہم اس کا ہلکا سا اعتراف ایک سابق امریکی صدر کلنٹن نے ۱۹۹۷ء میں کیلے فورنیا یونیورسٹی میں کیا:

> "We advanced across the Continent in the name of freedom, yet in doing so we pushed Native Americans off their land. We welcome immigrants but each new wave has felt the sting of discrimination.[۲۱]

بہرحال ان متعدد نہایت سنگین اور ہولناک ظالمانہ اقدامات کے مقابلے میں کلنٹن

کا یہ ہلکا سا اعتراف کوئی معنی نہیں رکھتا جو امریکہ نے قبل ازیں اور خصوصاً دوسری عالمی جنگ اور اس کے بعد پے در پے کیے۔ سلب ونہب کے تازہ تر ہدف افغانستان اور عراق ہیں۔ افغانستان میں ایسا اسلحہ استعمال کیا گیا جس میں ایٹمی اسلحے کے آثار پائے گئے۔ عراق اور اس کے بے مثال کلچر کو برباد کیا گیا حتّٰی کہ جنیوا کنوینشن کی کھلی خلاف ورزی کی گئی اور فلّوجہ کے ہسپتال پر فضائی حملے کیے گئے۔ ۱۹۹۶ء کے ری پبلکن کانگریس کے منظور شدہ وار کرائمز ایکٹ کو طاقِ نسیاں پر رکھا گیا جس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ جنیوا کنونشن کی صریح خلاف ورزی کی سزا موت ہے۔ اس کے باوجود ۲۰۰۶ء کے ملٹری کمشنز ایکٹ میں بش انتظامیہ کو ان جنگی جرائم سے معصوم قرار دے ڈالا گیا! ع

کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں؟

بدقسمتی یہ ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کی ضرب المثل بین الاقوامی سیاست میں بھی کامل صداقت رکھتی ہے۔ شاید قانون اور معاہدے کمزوروں کے لیے ہوتے ہیں قہاروں کے لیے نہیں۔ مثلاً یہی دیکھیے کہ NPT (نان پرولیفریشن ٹریٹی) کا آغاز ۱۹۷۰ء میں ہوا جس کے آرٹیکل چھے کے تحت ایٹمی اسلحے کو تباہ کرنے کا عہد کیا گیا مگر چونکہ بڑا فریق یعنی امریکہ ایسا کرنے پر آمادہ نہیں لہٰذا بیل منڈھے نہیں چڑھ سکی!

خوف کی فضا بندی، حریف تراشی، جعلی جمہوریتوں کا تحفظ اور متعدد دیگر نامسعود معاملات بھی دراصل اسی عالمگیریت کے عناصر ترکیبی ہیں جن کے بل پر اس سیارے کا مستقبل تاریک اور اس کا حال بے حال ہے۔ "Understanding Power" میں جعلی جمہوریتوں کی تفصیل بتاتے ہوئے چومسکی لکھتا ہے کہ ایل سلوا ڈور اور گوئٹے مالا میں حکومتوں کو فوج چلا رہی ہے۔ فوج کو مقامی جتھوں، زمینداروں، امیر کبیر تاجروں اور اُبھرتے ہوئے پیشہ وروں کا تحفظ مقصود ہے۔ ان سب لوگوں کے مفاد امریکہ سے بندھے ہیں لہٰذا یہ حکومتیں ''جمہوری'' ہیں۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا اگر یہ آزاد صحافت کو تہِ تیغ کر دیں، سیاسی مخالفوں کا قلع قمع

کردیں اور لاکھوں انسانوں کو قتل کردیں اور آزاد انتخابات سے کوسوں دور ہوں۔ یہ سب غیر متعلق ہے۔ یہ سب ''جمہوریتیں'' ہیں کیونکہ ان کی باگ ڈور ''صحیح لوگوں'' کے ہاتھ میں ہے (کتاب مذکور، ص۴۲)

مجھے یاد ہے میں بھی لاہور کے اس اجتماع میں موجود تھا جس میں چومسکی نے کئی برس پہلے بڑی عمدہ گفتگو کی تھی۔ کسی صحافی کے اس سوال کے جواب میں کہ امریکہ جمہوریت کی ترویج و بقا کے سلسلے میں کس قدر مخلص ہے، چومسکی نے بڑی بے باکی سے کہا تھا:

> ''امریکی حکومت کو اپنے کام سے غرض ہے۔ اگر یہ کام کسی آمر کے ذریعے نکل جائے تو وہ اچھا اور اگر کسی جمہوریت پسند کی طرف سے ہو جائے تو وہ خوب۔ باقی Despot اور Democrat امریکہ کے نزدیک اضافی اصطلاحیں ہیں''۔

چومسکی کہتا ہے کہ عالمگیر امریکی دانشوری نے ایک اور اصطلاح بھی وضع کر رکھی ہے اور وہ ہے ''ماڈریٹ'' (اعتدال پسند)۔ امریکہ کے نزدیک ماڈریٹ وہ ہے جو اس کا تابع ہو۔ ''ماڈریٹ'' کے بالمقابل ''ریڈیکل'' ہے یعنی وہ جو امریکی احکام کے سامنے سرِتسلیم خم نہ کرے اور جو اپنی الگ سوچ رکھتا ہو یا بالفاظِ دیگر جس نے بقول اقبال اپنی خودی کا عرفان اور شعور حاصل کر رکھا ہو۔ سعودی عرب کے تیل کے ذخائر اور مراکش میں موجود امریکی ہوائی اڈوں کی موجودگی کے باعث دونو ملک ماڈریٹ ہیں یعنی وہی سہاگن جسے پیا چاہے۔ چومسکی لکھتا ہے کہ امریکہ نے تو انڈونیشیا کے سابق صدر سوہارتو کو بھی موڈریٹ قرار دے رکھا تھا۔ یہ وہی ذاتِ شریف ہیں جنھوں نے امریکی پشت پناہی کے بل پر ۱۹۶۵ء میں فوجی انقلاب برپا کر کے اپنے پیشرو کا تختہ الٹا۔ پھر انڈونیشی فوج نے چار مہینے کے اندر اندر پانچ لاکھ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اگرچہ صحیح تعداد کسی کو بھی معلوم نہیں۔ یہ اکثر بے زمین کسان تھے:

کن نیندوں اب تُو سوتی ہے اے چشمِ گریہ ناک
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا!

اقبال نے ''ضربِ کلیم'' میں ایک نظم ''نصیحت'' کے زیرِ عنوان لکھی ہے جس میں

بڑی تہ رس فراست کے ساتھ منفی تعلیم کی شعبدہ کاری کی گرہیں کھولی ہیں:

سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر
کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر[۲۲]

ظاہر ہے یہاں اقبال کی مراد ایسی ایقان سوز اور شخصیت شکن تعلیم سے ہے جس کے نتیجے میں سونا مٹی کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ ادنیٰ میں ڈھل جاتا ہے، روشن تاریک ہو جاتا ہے۔ جمال زوال کے ہم معنی ہو جاتا ہے۔ یہی بات برنگِ دیگر چومسکی نے ایک سوال کے جواب میں کہی تھی۔ پوچھا گیا: عوام اپنے ذہن کیوں استعمال نہیں کرتے۔ چومسکی کا جواب تھا: عوام کو ایک نہایت پیچیدہ عمل تقطیر (Filtering System) کے تحت بعض سنگین مسئلوں اور قضیّوں سے دور رکھا جاتا ہے جس کا آغاز کنڈر گارٹن ہی سے ہو جاتا ہے۔ تمام تعلیمی اور پیشہ ورانہ نظام ایک نمایاں چھلنی ہے جو آغاز ہی میں ایسے افراد کو نکال باہر کرتی ہے جن کی سوچ آزادی پسند ہوتی ہے، جو اپنی رائے رکھتے ہیں اور جنھیں ہر چیز کو قبول اور تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ ایسے لوگ نام نہاد اداروں کے لیے ناموزوں ہوتے ہیں۔ میڈیا میں ایسے لوگوں کی کیا ضرورت جو ٹیڑھے سوال کرتے ہوں۔ بڑے عہدوں کے لیے بعض اقدار مخصوص افراد کے ذہنوں میں راسخ کردی جاتی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض چیزیں کہنے کی نہیں ہوتیں اور آپ کو ان کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے گویا بقول امیر مینائی: ع

آنکھ آئینے کی پیدا کر، دہن تصویر کا

ذرا آگے چل کر چومسکی کہتا ہے کہ جارج آرویل (۱۹۰۳-۱۹۵۰) نے سالہا سال پہلے اس موضوع پر دلچسپ بحث کی تھی۔ یہ مضمون دراصل اس کی مشہور تمثیل ''اینیمل فارم'' کا

دیباچہ تھا اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ اینیمل فارم دراصل روس کی آمریت پر ایک لطیف طنز تھا۔ لوگ اس ناول کو تو پڑھتے ہیں مگر عام طور پر اس کے دیباچے پر توجہ نہیں دیتے جو انگلستان میں سنسر شپ کے متعلق ہے۔ لوگ بھی اس دیباچے کو کیسے پڑھتے کہ اسے سنسر کر دیا گیا تھا۔ مراد یہ کہ ناول میں اسے شائع نہیں کیا گیا تھا۔ اسے کم و بیش ناول کی اشاعت کے تیس برس بعد دریافت کیا گیا اور کسی نے اسے شائع کر دیا۔ اب یہ بعض نئے ایڈیشنوں میں پایا جاتا ہے۔ آرویل نے اس دیباچے میں لکھا تھا کہ اگرچہ یہ کتاب اسٹالینی عہد کے بارے میں ہے لیکن انگلستان کی صورتِ حال بھی روس سے مختلف نہیں۔ انگلستان کے پریس پر اُمراء کا قبضہ ہے[۲۳] اور وہ نہیں چاہتے کہ بعض چیزیں منظر عام پر آئیں۔ آرویل نے دوسری بات یہ لکھی تھی کہ آپ پڑھے لکھے ہیں، آپ نہایت موزوں پریپ اسکولوں میں پڑھے۔ پھر آکسفرڈ گئے اور اب آپ ایک بڑے ادارے کی توپ شے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ بعض چیزیں کہنے کی نہیں ہوتیں (کتاب مذکور ص ۱۱۲، ۱۱۳)

اقبال کے آخری مجموعۂ کلام ارمغانِ حجاز میں ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' نامی نظم میں ابلیس کا پہلا مشیر کیسی پتے کی بات کہتا ہے:

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خودنگر

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر

مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر[۲۴]

مغربی استعماری ممالک اور امریکہ بھی وہ سلطان ہیں جو جمہوریت کا بہروپ دھارے غیر کی کھیتیوں کو ہڑپ کرتے اور اجاڑتے چلے جاتے ہیں۔ ویت نام، کیوبا، نکاراگوا، ہیٹی، لیبیا، افغانستان، عراق کس کس کا نام لیا جائے۔

بے محل نہ ہوگا کہ اگر امریکہ کے عالمگیریت کے منصوبے کی ایک شق یعنی مشرقِ وسطیٰ کے قضیے پر نگاہ نہ ڈالی جائے۔ چومسکی کے بقول ہر شخص اس مسئلے کا حل سمجھتا ہے مگر امریکہ اور اسرائیل کے استثنا کے ساتھ۔ امریکہ پچھلے بیس برس سے مسئلے کو پر امن طریقے سے حل کرنے میں رکاوٹیں ڈال رہا ہے۔۔۔امریکی منصوبہ ساز مشرقِ وسطیٰ کے تیل کے بے پناہ ذخائر پر تصرف کے متمنی ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں امریکہ نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اسرائیل ایک مفید حواری ثابت ہوسکتا ہے مثلاً ۱۹۵۸ء کا سیکیوریٹی کونسل کا ایک یادداشت نامہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو مشرقِ وسطیٰ میں (ہر جگہ کی طرح) دشمن قومیت پرستی کا سامنا ہے۔ جس شے کو ''ریڈیکل عرب نیشنلزم'' کہا جاتا ہے اس کا مطلب ہے آزادی۔ یہ وہ ملک ہیں جو امریکی اقتدار کی ضروریات کی اطاعت کرنے کے بجائے اپنے بنائے ہوئے رستے پر گامزن ہیں لہٰذا وہ امریکہ کے دشمن قرار پائے۔ یہ ملک سوچتے ہیں کہ خطے کے ذخائر اور دولت امریکی یا برطانوی کنٹرول میں کیوں رہے جبکہ مقامی لوگ بھوکوں مر رہے ہوں اور یہ سب کچھ امریکہ کے لیے قابلِ قبول نہیں۔ امریکہ کی نگاہ میں خلیج کے علاقے کے سرپرست ایران اور اسرائیل تھے۔ ۱۹۷۹ء میں شاہ ایران کے اِخراج اور بے دخلی کے بعد اب خلیج کا سرپرست امریکہ کی نگاہ میں صرف اسرائیل ہے۔ ۱۹۷۰ اور ۱۹۸۰ کی دہائیوں میں امریکہ کا اسرائیل کی طرف میلان اور بڑھ گیا۔ یہ میلان تیسری دنیا کے ممالک کے خلاف اسرائیل کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے لیے تھا۔ اسرائیل کو یہ فرض سونپا گیا کہ وہ تیسری دنیا کے آمروں کو اسلحہ، تربیت، کمپیوٹر اور دیگر سہولتیں فراہم کرے گا کیونکہ اس وقت خود امریکہ کے لیے ایسے اقدامات براہِ راست ممکن نہ تھے۔ (انڈرسٹینڈنگ پاور، ص ۱۲۶)

کمزور ملکوں کو دبانے، انھیں کنٹرول کرنے اور انھیں اپنی مرضی کے مطابق بھیڑ بکری کی طرح ہانکنے کا یہ سارا بندوبست عالمگیریت کے اصلی چہرے سے نقاب سرکانے کے لیے کافی ہے۔ اقبال آزادی، حریت، عرفانِ ذات، اور شرفِ انسانیت کے مُنّاد تھے۔ مغرب کی سفاکانہ استعماری چالوں پر نہایت گہری نظر رکھتے تھے۔ جب تک زندہ رہے کشمیر اور فلسطین ہی نہیں دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کے حق میں آواز بلند کرتے رہے۔ وہ مغرب کے سوداگرانہ حربوں کی تہہ تک جھانک لیتے تھے ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' میں مغرب کی میٹھی چھری کے اصل عزائم اور اس کی تاجرانہ ذہنیت کو اس خوبی سے طشت از بام کرتے ہیں کہ اردو شاعری تو کیا فارسی شاعری میں بھی اس کی مثال نایاب ہے۔ میں نے عرصہ ہوا اس کے بعض حصوں کا منظوم آزاد ترجمہ کیا تھا۔ صرف دو بند آپ بھی سن لیجیے:

(۱)

افرنگی کے ہاتھوں نوعِ انساں کرب میں ہے
اور حیات کے ہنگاموں کی دنیا سرد، خنک
اے اقوام شرق تمھیں کیا کچھ کرنا ہے
مشرق کے دن پھر سے کچھ روشن روشن ہیں
اس کے باطن میں اک تازہ طوفاں
انگڑائی لے کر جاگا ہے
رات گئی، خورشیدِ خاور اپنی کرنوں کے لاؤ لشکر کے ساتھ
صبح کے تخت پہ آن براجا ہے
(صبح کا راجہ ہے)
یورپ خود اپنی شمشیر سے گھائل ہے
اِس نیلے انبر کے نیچے اس نے لادینی کی رسمِ تیرہ کی بنیاد رکھی

برّۂ سادہ لوح کے بھیس میں ظالم گرگ ہے یہ
ہر لحظہ اپنے نخچیر کی گھات میں ہے
اس کی نظر میں آدم بس مجموعۂ آب و گل
اور حیات جہات سے عاری بے میل و منزل

(۲)

تو افرنگی کے کرتوتوں سے واقف ہے
پھر یہ قیدِ فرنگ کہاں تک؟
یہ ظالم افرنگی ہمارے وجود پہ نشتر زن ہے
زخم زخم ہے، لہولہو ہے اپنا بھیتر، باہر
اے وائے امیدِ رفو بھی اسی سے ہم نے لگائی
(ہائے نابینائی)
تو واقف ہے
شاہ جو ہوتا ہے وہ قاہر ہوتا ہے
اور عہدِ موجود میں قاہر ہونا سوداگر ہونا ہے
تخت و تاج میں حصہ دار ہے اب دکان کا تختہ!
یہ افرنگی حاکم بھی تو اصل میں سوداگر ہے
اس کی زباں پہ خیر کا کلمہ اور پہلو میں شر ہے
گر تو نگاہِ ہوش سے دیکھے آئے تجھ کو نظر
اس کے حریر سے، نرم و نازک تر تیرا کھدّر
تو اُس کے بازار سے مثلِ موجِ نسیم گزر
اس کے لباسِ گرم سے، ٹھنڈی موت کہیں بہتر

قتل کرے ہے بے حرب و بے ضرب و بے ساطور
اس کی مشینوں کی گردش میں موت کا پھنکتا صُور
تو اس کے قالین کے بدلے
اپنی چٹائی ــــ اپنی میلی اور گلِ خوردہ
سیلن زدہ چٹائی کا سودا مت کر
اپنا پیادہ اس کی فرزیں کے بدلے میں نہ دے
عیب دار ہے اس کا گوہر، لعل اس کا ناقص ہے
اس کی کستوری کا نہ پوچھو ــــ نافِ سگ کی عفونت
اس کی مخمل پر ہوتے ہیں سارے خواب حرام
اس کے میخانے میں مرجاتے ہیں مے آشام
اے فرزندِ مشرق، مردِ حر، مردِ آزاد
آنکھیں کھول اور یورپ کی عیاری دیکھ
تیری آنکھ میں دھول جھونک کے تیرے ہی ریشم سے
یہ قالین بنائے
اس کی ایک جھلک دکھلا کر پھر یہ تجھ کو لبھائے
تیری بھولی آنکھ پہ جادو اس کا بولتا ہے سر چڑھ کر
اس کی چمک دمک کا سیل بے پایاں
تنکے کی صورت میں تجھے بہالے جاتا ہے
تُف ہے اُس دریا پر، جس میں موجیں مارنہیں کرتی ہیں
اور جو غواصوں کے ہاتھوں
اپنے ہی موتی کا خود گاہک بنتا ہے[۲۵]

اقبال جیسا بالغ نظر، روشن دماغ اور اپنی انگلیوں کی پوروں تک نوع انسانی کے

درد سے سرشار، معاشی خود انحصاری کا علم بردار اور ملتِ اسلامیہ کی نشأۃِ ثانیہ کا خواب دیکھنے والا شاہِ دریا آستیں بھی ایک اور طرح کی عالمگیریت، ایک مختلف نئے ورلڈ آرڈر کا روشن اور نشاط انگیز تصور رکھتا تھا مگر اس کے لیے وسعتِ نگاہ کی شرط لگاتا تھا اور حق یہ ہے کہ یہ وسعت نگاہ اعلیٰ روحانی تصورات اور خالص تصورِ توحید ہی کا فیضان ہے۔ اس کا خیال تھا اور کس قدر درست خیال تھا کہ:

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی

اپنے چھٹے خطبے ''الاجتہاد فی الاسلام'' کے آخر میں اقبال نے کس دلسوزی سے کہا تھا:

''عالم انسانی کو آج تین چیزوں کی ضرورت ہے: کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کا روحانی استخلاص، اور وہ بنیادی اصول جن کی نوعیت عالمگیر ہو اور جن سے انسانی معاشرے کا ارتقا روحانی اساس پر ہوتا رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں جدید یورپ نے اسی نہج پر متعدد عینی نظامات قائم کئے لیکن تجربہ کہتا ہے کہ جس حق و صداقت کا انکشاف عقلِ محض کی وساطت سے ہو اس کے ایمان و یقین میں وہ حرارت پیدا نہیں ہوتی جو وحی و تنزیل کی بدولت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقلِ محض نے انسان کو بہت کم متاثر کیا۔۔۔ اب حالت یہ ہے کہ یورپ کی فسادزدہ خودی باہمد گر حریف جمہوریتوں کی شکل میں جن کا مقصد وحید ہی یہ ہے کہ دولت مندوں کی خاطر ناداروں کا حق چھینے، اپنے تقاضے پورا کررہی ہے۔ یقین کیجیے یورپ سے بڑھ کر آج انسان کے اخلاقی ارتقاء میں بڑی رکاوٹ کوئی نہیں''[۲۶]

اقبال کے اصل الفاظ انگریزی میں یوں تھے:

"Believe me Europe today is the greatest hindrance in the way of man's ethical advancement."

مجھے یقین ہے کہ اگر اقبال آج زندہ ہوتے تو یورپ کا نام کاٹ کر اس کی جگہ امریکہ کا نام لکھ دیتے کہ عالمگیریت کی علمبردار اس واحد عالمی قوت نے اس دھرتی، اس عالم کی بقا پر ایک بڑا سوالیہ نشان قائم کردیا ہے!

(خلیفہ عبدالحکیم میموریل لیکچر، منعقدہ ۲۱ رمارچ ۲۰۱۴ء)

حواشی : (از قلم مصنف)

۱- Islam & the Muslim Ummah، ۲۰۰۰ء (جلد دوم) پلا ندک پبلی کیشنز، ملائشیا، ص۵۶، ۵۷

۲- کلیاتِ اقبال اردو، (شیخ غلام علی اینڈ سنز)، ۱۹۸۴ء، ص۲۶۱

۳- دس برس بھی بیت چکے مگر اس سخت جان اصطلاح پر بحث اب بھی جاری ہے اور رہے گی۔

۴- Deviant Globalization (مرتبہ Goldhammer, Nils Gilman، Weber، مطبوعہ Continuum، ۲۰۱۱، ص۶

۵- فوکویاما کی کتاب End of History کی طرف اشارہ ہے۔

۶- بحوالۂ سابقہ، ص۸

۷- کلیاتِ اقبال بحوالۂ سابقہ، ص۶۱۱

۸- Religion—Significance & Meaning، سہیل اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۲، ص۴۶

۹- یہ الگ بات کہ خود لینن کا لایا ہوا اشتراکی نظام بھی صرف ''مساواتِ شکم'' ہی کو پوری اور کلی حقیقت قرار دیتا ہے اور اس میں مذہب اور مابعد الطبیعیات کی کوئی گنجائش نہیں۔ کسریت اور یک رخے پن کے باعث بالآخر اشتراکیت بھی پیوند خاک ہو کر رہی۔

۱۰- کلیاتِ اقبال بحوالۂ سابقہ، ص۴۰۱

۱۱- کلیاتِ اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۸، ص۶۶۸

۱۲- "Why do People Hate America"، ص۸۶

۱۳- واضح رہے کہ سعودی عرب، کویت اور دیگر خلیجی ممالک کا امریکی اور برطانوی بنکوں میں جمع ہونے والا سرمایہ ان ملکوں کی قومی معیشت کے لیے نعمت کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۴- اس ضمن میں قارئین کو کثیر القومی کارپوریشنوں کے ہوش ربا اور ہمہ گیر منفی، مادہ پرستانہ اور امیر نواز طرزِ اعمال کی تفصیل جاننے کے لیے خالد رحمٰن کا مقالہ ''کثیر القومی کارپوریشنیں: متعلقہ معاشروں میں ان کا سماجی و معاشی کردار'' پڑھنا چاہیے، مشمولہ مجلّہ ''مغرب اور اسلام'' ___ عالمگیریت کا چیلنج اور مسلمان، شمارہ ۳۴، جلد اول، آئی پی ایس، اسلام آباد، ص۴۲-۷۶

۱۵- اصل متن کے لیے دیکھیے کلیاتِ اقبال (فارسی) بحوالۂ سابقہ، ص۸۳۷

۱۶- کیوبا میں ۱۹۶۱ء میں امریکہ نے کمانڈ آپریشن کیا۔ وہ ہمیشہ کیوبا سے حملے کا ہوا کھڑا کرتا رہا ہے۔ متعدد تجارتی پابندیوں اور فیڈل کاسٹرو کا تختہ الٹنے کی متعدد کوششوں کے باعث کیوبا نے اپنے کمیونسٹ ہونے کا اعلان کیا اور مزید امریکی ناراضی کا باعث بنا۔ نکاراگوا کے جمہوری الیکشن کو تلپٹ

کرنے کے لیے لاکھوں ڈالر جھونک دیے گئے۔ پانامہ کے ۱۹۸۴ء کے انتخابات میں شدید مداخلت کی گئی۔ ۱۹۷۳ء میں چلّی پر جنرل پنوشے کو مسلط کیا گیا کیونکہ وہ دائیں بازو سے تعلق رکھتا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں گوئٹے مالا حکومت اور بائیں بازو والوں میں خانہ جنگی چھڑ گئی جو ۱۹۹۶ء تک جاری رہی۔ ۱۹۶۶ء میں امریکہ نے یہاں کمانڈ آپریشن کیا اور باغیوں (بائیں بازو والے) کا قلع قمع کیا۔ سلواڈور میں بحری جنگی جہاز بھیجے۔ اکتوبر ۱۹۸۳ء میں گریناڈا کے ننھے سے جزیرے پر حملہ کیا گیا۔ یہ محض چند مثالیں ہیں۔ تفصیل کے لیے ایک دفتر چاہیے۔

۱۷- ضیاء الدین سردار و میری وِن ڈیویز: "Why do People Hate America?"، آئی کن بکس، یو-کے، ۲۰۰۲ء، ص ۶۷

۱۸- تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب مذکور کے ص ۹۲-۱۰۱

۱۹- کلیاتِ اقبال بحوالۂ سابقہ، ص ۶۱۱، ۶۱۲

۲۰- ''کلچر اینڈ امپیریلزم'' (ونٹیج پریس، ۱۹۹۳ء)، ص ۳۸۱

۲۱- ضیاء الدین سردار و میری وِن ڈیویز بحوالۂ سابقہ، ص ۵۹

۲۲- کلیاتِ اقبال (اردو) بحوالۂ سابقہ، ص ۶۱۶

۲۳- قارئین کو یاد ہوگا کہ پروفیسر احمد علی کا ناول Twilight in Delhi کئی برس تک انگریزی پریس نے شائع نہیں کیا تھا کہ اس میں کچھ باتیں انگریز راج کے سرکاری موقف کے مطابق نہ تھیں۔ بہت برس بعد غالباً سنسر ہو کر ورجینیا وولف کی سفارش سے شائع ہوا۔

۲۴- کلیاتِ اقبال (اردو) بحوالہ مذکورہ، ص ۶۴۹، ۶۵۰

۲۵- شاخِ زریاب (الحمد پبلی کیشنز)، ۲۰۱۲، ص ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۴-۱۵۶

۲۶- تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (مترجم سید نذیر نیازی)، بزم اقبال لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۲۷۶

☆☆☆